''قدیم اُردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط'' تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر الماس خانم، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Language is not only an important source of identity of a humanbeing and a nation but also guarantees their survival. human history is a testimony that when a language of any nation died, nation also died. Due to the importance of languages today languages are being studied under scientific principles but Pakistan is far behind this scientific knowledge. In this situation " Qadim Urdu(Dakkani) aur Punjabi ke Lissani Rawabit" is very important. So main purpose of this study is to highligh main features of this linguistics research. An other aim of this study is to map out the importance of this study in light of linguistics perspective of Urdu.

دُنیا میں بولی جانے والی کم و بیش سات ہزار زبانوں میں سے بیشتر زبانیں کسی نہ کسی حوالے سے باہمی لسانی روابط کی حامل ہیں اور ان لسانی روابط کو ثابت کرنے کے لیے دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں قائم زبانوں کے تحقیقی مراکز میں زیادہ توجہ زبانوں کے تقابلی جائزے پر ہی دی جا رہی ہے۔ یہ تقابلی جائزہ نہ صرف ایک ہی علاقے کی مختلف زبانوں پر مشتمل ہے بلکہ تمام دنیا کی مختلف زبانوں کے باہمی جائزے پر بھی مشتمل ہے۔ فی زمانہ لسانیات کا علم سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لسانی و لسانیاتی تحقیق دنیا میں ہونے والی تحقیق سے کم و بیش سو برس پیچھے ہے۔ اس ضمن میں مختلف وجوہات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک بنیادی وجہ وسائل کی عدم فراہمی ہے۔ پاکستان میں لسانیات پر کام کرنے والا ایسا کوئی ایک ادارہ بھی موجود نہیں جو اس شعبے میں سائنسی بنیادوں پر کام کر رہا ہو۔ لسانیات پر ہونے والا بیشتر کام انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن ان میں سے بھی کوئی ایک کام ایسا نہیں جسے جدید طرز کا حامل قرار دیا جا سکے۔ اردو میں لسانیات کے موضوع پر خالصتاً تحقیقی بنیادوں پر مشتمل کتب کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ جو کتب دستیاب ہیں وہ بھی زیادہ تر ترجمہ شدہ ہیں۔ اگر گذشتہ چند دہائیوں میں اردو میں لسانیات کے موضوع پر ہونے والے کام کا جائزہ لیا جائے تو کوئی قابلِ قدر کام سامنے نہیں آتا بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''میں اگر دوربین لگا کر بھی دیکھوں تو حال میں کوئی ماہرِ لسانیات نظر نہیں آتا''[۱] کیونکہ لسانیات کے موضوع پر کام کرنا ہرگز آسان نہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے کے لیے نہ صرف جدید سائینٹیفک تجربہ گاہیں ضروری ہیں بلکہ خالص محققانہ مزاج کے حامل لوگوں کا ہونا بھی لازم ہے۔ ان حالات میں دکنیات

پر تحقیق کرنا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ''دکنی متون کو پڑھنا صرف دقت طلب کام ہی نہیں بلکہ اذیت ناک بھی ہے کیونکہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا متن پڑھنا بہت دشوار ہے۔''[۲] لسانیاتی تحقیق کی اس فضا میں ''قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط'' یقیناً ہوا کا تازہ جھونکا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ڈاکٹر ریاض قدیر کے محققانہ مزاج کی آئینہ دار ہے بلکہ ان کی کئی دہائیوں پر محیط محنتِ شاقہ کی عکاس بھی ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر اس اہم اور مشکل ترین موضوع کی طرف کیوں اور کیسے متوجہ ہوئے اس ضمن میں وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۹۸۰ میں ایم۔اے اردو کے تحقیقی مقالے کے لیے جب میں ایک تین سو سالہ قدیم دکنی نثر کے مخطوطے 'حجۃ الاسلام' کی تدوین کا کام کر رہا تھا تو مجھے دکنی نظم و نثر کے متعدد نمونے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک پنجابی ہونے کی حیثیت سے بار بار مجھے یہ احساس ہوتا کہ دکنی اور پنجابی زبانوں میں بہت سے لسانی اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے اس احساس کا ذکر استادِ محترم ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم سے کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان کے حوالے سے یہ تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں زبانوں میں پائے جانے والے صرفی و نحوی اشتراکات پر مبنی ایک مختصر تحقیقی مضمون تحریر کیا جو ماہنامہ 'ماہِ نو' کے شمارہ فروری ۱۹۸۳ میں 'دکنی اور پنجابی کے لسانی روابط' کے نام سے شائع ہوا۔ بعد ازاں میں ایک طویل عرصے تک اس موضوع پر ٹِک کر کام نہ کر سکا لیکن یہ موضوع ہمیشہ میرے لاشعور میں اٹکا رہا۔''[۳]

لسانیاتی تحقیق کا یہ وہ بیج تھا جو ۱۹۸۳ میں ڈاکٹر ریاض قدیر کی لاشعور کی سرزمین میں بو یا گیا اور ۲۰۱۷ میں ایک تن آور درخت کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔ دکنی اور پنجابی کے لسانی اشتراک کی تلاش میں ڈاکٹر ریاض قدیر کو دکنی اور پنجابی کے کلاسیکی متون کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ انہوں نے صرف دکنی اور پنجابی کے مشترک الفاظ کھوجنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اشتراک کو ثابت کرنے کے لیے قواعدِ صرف و نحو کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ اس کتاب کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ دکن اور پنجاب کی تاریخ اور ان کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔

پنجابی اور دکنی اس خطہ کی نمایاں اور اہم ترین زبانوں میں سے ہیں۔ ایتھنو لاگ میں دکنی زبان کے بارے میں یہ معلومات درج ہیں کہ یہ زبان گجرات، مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا، بلگام، بیجاپور، کرناٹک وغیرہ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد 12,800,000 بتائی گئی ہے۔ اس کا رسم الخط عربی، نسخ، نستعلیق اور دیوناگری ہے۔''[۴] ''دکنی زبان جس فضا میں پیدا ہوئی بلاشبہ اس پر ماحول کا اثر اجتماعی طور پر پڑا۔ لہٰذا دکنی کئی زبانوں کا آمیزہ ہے، جو مختلف بولیوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔ جہاں جہاں یہ پھیلی اس پر مقامی بولیوں کے اثرات پڑے۔ آگے چل کر دکنی نے مرہٹی، گجراتی، کنڑی اور تلگو زبانوں کے بھی اثر و نفوذ قبول کیے مختلف بولیوں کی ملاوٹ قبول کر لینے سے جس نئی زبان کی بنیاد پڑی وہ سکھنی یا دکنی کہلائی۔''[۵]

مختلف ادوار میں پنجاب مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا۔ مورخین نے پنجاب کے مختلف زمانوں میں

رائج جن ناموں کی نشاندہی کی ہے ان میں سپت سندھو، پیتہ ہیندوس، ٹ ٹ گوش، پنج ند، ہیلیک یا ہیک، مدر دیس، ٹک دیس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب کا موجودہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد رائج ہوا۔ گویا پنجابی 'زبان' کے معنی میں بھی مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی مستعمل ہوئی۔ لیکن جس طرح اس علاقہ کو جو آج پنجاب کہلاتا ہے مختلف ناموں سے پاکارا جاتا رہا اسی طرح پنجابی زبان کے لیے بھی مختلف نام رائج رہے۔ جہاں تک پنجابی زبان کے آغاز و ارتقا کا تعلق ہے اس ضمن میں حمید اللہ ہاشمی نے اپنی کتاب ''مختصر تاریخ زبان و ادب پنجابی'' میں دو نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں کہ ''پنجابی زبان کے بارے میں اب تک دو نظریے سامنے آئے ہیں۔ (۱) پہلا نظریہ یہ ہے کہ پنجابی زبان آریائی کنبے (گروہ) کی زبان ہے۔ یعنی پنجابی زبان سنسکرت زبان کی وارث ہے۔ (۲) دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پنجابی زبان غیر آریائی کنبے (گروہ) یعنی دراوڑی، منڈا کنبے (گروہ) کی زبان ہے''۔ ۶ مختلف ماہرینِ لسانیات کے بیانات کی روشنی میں حمید اللہ ہاشمی پنجابی زبان کے شمالی ہند کی زبانوں سے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''جدید ماہرین لسانیات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان پنجابی زبان کی قدیم شکل ہے جس کی مورث اعلیٰ دراوڑی زبانیں ہیں۔'' ۷ پنجابی زبان کے بارے میں حمید اللہ ہاشمی اپنی ایک اور تصنیف ''پنجابی زبان و ادب'' میں لکھتے ہیں کہ ''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پنجابی دراصل اس خطے کی زبان ہے جو پانچ دریاؤں (ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم) کی آغوش میں گھری ہوئی سرزمین 'پنجاب' ہے لیکن جدید تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ پنجابی زبان ایک وسیع و عریض خطے کی زبان ہے۔ اس زبان کا پھیلاؤ دھلی (بھارت) سے لے کر خیر پور (سندھ) تک اور پشاور و درۂ کاغان (صوبہ سرحد) سے لے کر جموں و سری نگر (مقبوضہ کشمیر) تک وسیع ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی پنجاب کی حدود کے آثار مغرب میں جلال آباد (افغانستان) تک ملتے ہیں۔'' ۸ یہ وہی نظریہ ہے جس کی طرف حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' میں اشارہ کیا تھا ''پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے۔ بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے ادھر دریائے گھگھر تک آ گئی ہے ادھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے''۔ ۹ پنجاب اور پنجابی کے بارے میں ڈاکٹر محمد باقر کا یہ بیان بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ: ''خود 'پنجاب' کا لفظ ہماری یعنی ہندو پاک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جہانگیر کے عہد ۱۶۰۵۔۱۶۲۷ء میں استعمال ہوتا ہے اور غالباً وہی پہلا شخص ہے جو اپنی توزک میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ اکبر کے عہد ۱۵۵۶۔۱۶۰۵ء میں یہ لفظ بظاہر استعمال ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس زبان کو ہم اس وقت پنجابی کہہ رہے ہیں اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا، کیونکہ جہانگیر کے زمانے سے پیشتر اس علاقے کا نام ہی کچھ اور تھا'' ۱۰ مذکورہ بالا بیانات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم عہد میں پنجابی زبان کے اثرات وسیع تھے۔ کیفی کے بقول ''پنجابی کے بارے میں دو خاص باتیں ذکر کے قابل ہیں ایک تو یہ کہ شورسنی پراکرت کے آثار جس قدر پنجابی میں پائے جاتے ہیں اور آج تک موجود ہیں اتنے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے اور دوسرے یہ کہ غیر ملکی الفاظ سے مہمان نوازی کا برتاؤ سب سے

پہلے اس کے حصے میں آیا''[۱۱] کیفی نے اپنی تحقیق کا یہ نچوڑ پیش کیا ہے کہ ''اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔''[۱۲] اور یہ کہ ''دہلی سے اردو دکن میں گئی''۔[۱۳] اسی لیے اہلِ دکن اور اہلِ پنجاب اپنی اپنی زبان کو اردو کی قدیم تر شکل قرار دینے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو'' اور حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ ''دکن میں اردو'' کے باب ''دکن میں اردو نثر و نظم کی ابتدا'' میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ: ''اس امر کا ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعوٰی کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی۔''[۱۴] جبکہ حافظ محمود شیرانی ''عرضِ حال'' میں لکھتے ہیں کہ ''اس تالیف میں اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً ان مسائل پر جن کی رُو سے پنجاب، اس زبان کی ابتدا، اور اس کی نشو و نما کا گہوارہ مانا جا سکتا ہے۔''[۱۵] شیرانی سیاسی حالات کے تناظر میں مزید بیان کرتے ہیں کہ ''یہ امر اظہر من الشّمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صحیح طور پر آشکارا ہو جاتا ہے''[۱۶] شیرانی نے اردو اور پنجابی کی مماثلت ثابت کرنے کے لیے ایک علیحدہ باب ''پنجابی اور اردو'' کے تحت پنجابی اور اردو صرف و نحو سے بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض مقامات پر اردو، دکنی اور پنجابی صرف و نحو کے اشتراکات کی مثالیں بھی دی ہیں جن پر سخت تنقید کرتے ہوئے مسعود حسین خان کہتے ہیں کہ:

''پروفیسر شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ راجستھانی اور گجراتی کیطرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات کی نشاندہی آج بھی کیجا سکتی ہے۔ بعد کو (شاید شورشینی اپ بھرنش کے عہد عروج میں) اسپر اندرونی زبان۔۔۔ دیش کی زبان جسکی نمائندہ بولیاں برج اور کھڑی ہیں) کا اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اسکی صورت بدل گئی۔ اسکا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پنجابی کے درمیان خط فاصل کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقہ پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریرسن کے خیال میں کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا چھائی ہوئی تھی۔ جسے بعد کو دوآبہ کی بولیوں نے پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا اور رچنا دوآب تک ہٹا دیا۔ دوآبہ کی زبان کے نشانات سندھ ساگر دوآب تک کی لہندا میں پائے جاتے ہیں۔ جوں جوں مشرق کی سمت آیئے اس کا رنگ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے راجستھانی اور گجراتی کیطرح پنجابی کو 'ملواں' زبانوں کی صف میں جگہ دی گئی۔۔۔ چنانچہ اردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے تو دوسری طرف ہریانی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ آجکل کی معیاری اردو مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں یہ جمنا پار کی ہریانی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ قدیم دکنی میں بعض اثرات پنجابی کے بھی جھلکتے ہیں اس لیے تقابلی مطالعہ کا میدان ذرا وسیع ہونا چاہیے

اور جہاں تک ہو سکے پنجابی، اردو، ہریانی اور برج بھاشا کی ادبیات کے قدیم ترین نمونوں پر نظر رکھنے چاہیے۔''[۱۷]

مسعود حسین خان نے ''اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر'' میں البتہ دکنی اور پنجابی کے اشتراک کی طرف ایک خفیف سا اشارہ بھی کیا ہے کہ ''مستقبل بنانے کے لیے گا، گی، گے کے علاوہ دکنی اردو کی ایک خصوصی شکل [س] کے مرکبات سے بنتی ہے جیسے، مارسوں (ماردوں گا)، مارے (تو یا وہ مارے گا)۔ یہ غالباً پنجابی سے مستعار ہے۔ خیر المجالس کے ایک ہندوی فقرے 'ارے مولانا! یہ بڈھا ہوسی' (یعنی ایں مرد بزرگ خواہد شد) میں یہ پہلی بار دکھائی دیتی ہے''[۱۸] جبکہ ایک اور جگہ مسعود حسین خان نے گوجری اور دکھنی کے اشتراکات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں کہ ''گوجری اور دکھنی میں نمایاں فرق نہیں جس کا ثبوت احمد گجراتی کی مثنوی 'یوسف زلیخا' ہے جو اس نے گول کنڈہ کے فرماں روا محمد قلی قطب شاہ کی دعوت پر گجرات سے گولکنڈہ آ کر لکھی تھی۔'' لیکن ان کا مفروضہ یہی ہے کہ قدیم اردو، پنجابی کے بجائے ہریانوی سے زیادہ قریب ہے اور انہوں نے تقابل سے ثابت کیا ہے کہ ان دونوں زباوں میں لسانی اشتراکات پائے جاتے ہیں[۱۹] ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مسعود حسین خاں کے ''پنجاب میں اردو'' مخالفت نظریہ کو ان کا سیاسی تعصب قرار دیا ہے۔ 'ڈاکٹر تبسم کاشمیری پنجاب میں اردو مخالف نظریات اور ان کے مقابل حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر ریاض قدیر کے تحقیقی کاموں پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہوئے بیان کرتے ہیں[۲۰] کہ صرف پاکستان میں یہ نظریہ ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی یا اس کا ہیولیٰ پنجاب میں پیدا ہوا جبکہ ہندوستان میں اس کے مخالف نظریہ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ مسعود حسین خان پنجاب میں اردو کے نظریے کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اردو دہلی اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں پروان چڑھی۔ انہوں نے اس حوالے سے ہریانوی کو اہمیت دی۔ وہ ایک سیاسی مفروضہ تھا لسانی مفروضہ نہ تھا۔ انہوں نے شیرانی کے نظریے کو اس لیے رد کیا کہ وہ اردو کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے جوڑنا چاہتے تھے۔ شیرانی نے جو باتیں پنجابی اور دکنی کے بارے میں کہیں مسعود حسین خان نے وہ سب ہریانوی کے ساتھ جوڑ دیں۔ شیرانی نے ثابت کیا کہ پنجابی ایک قدیم ترین زبان ہے جبکہ ہریانوی اس کے مقابل کم عمر ہے اور اس کی عمر کوئی تین سو سال ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دکن میں مسلمانوں کی آمد سے قبل دکنی زبان کا وجود تھا؟ شیرانی صاحب نے اردو کو مسلمانوں کی آمد سے جوڑ دیا لیکن ہندوستان کے اسکالر شرما کا مفروضہ ہے کہ دکنی، سنسکرت سے نکلی ہے یہ بہت مضبوط مفروضہ ہے۔ انہوں نے بھی بے شمار مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل دکنی موجود تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر زیادہ تر مثالیں نکلتی ہیں تو صرف پنجابی سے نکلتی ہیں۔ یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دکنی کے لسانی ڈھانچے میں مختلف زبانوں کے ملنے والے لفظی ذخیرے کا تناسب کیا ہے؟ بظاہر ہمیں ڈاکٹر ریاض قدیر کی کتاب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید سب سے بڑا ذخیرہ پنجابی الفاظ ہی کا ہے۔ ریاض قدیر نے جو تحقیقی کام کیا ہے اس کے پس منظر میں مندرجہ بالا لسانی و تاریخی عناصر کارفرما ہیں۔ یوں تو شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' نے پہلی بار پنجابی کے لسانی نقش کی وسعت و اہمیت پر مہر لگا دی اور اردو کے ابتدائی ہیولے کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کثیر مقدار میں

مثالیں فراہم کی ہیں لیکن ڈاکٹر ریاض قدیر کی کتاب میں پنجابی اور دکنی کے اشتراک کی مثالوں کا اتنا بڑا ذخیرہ پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔[۲۱] ان مباحث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ لسانی محققین کی ان کاوشوں سے اردو زبان میں تقابلی لسانیات کے در وا ہوئے اور علاقائی سطح پر اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے جائزے کا رجحان پروان چڑھا۔

دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی زبان ہو جس کا دنیا کی کسی دوسری زبان کے ساتھ کوئی لسانی رشتہ نہ ہو۔ ہر زبان کسی دوسری یا بہت سی دیگر زبانوں سے جڑی ہوئی ہے۔ ایک زبان نہ صرف دوسری زبان یا زبانوں سے اثر و نفوذ قبول کرتی ہے بلکہ اس اثر و نفوذ سے پھیلتی پھولتی بھی ہے۔ برِ صغیر کا خطہ کثیر التہذیبی خطہ ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر اللسانی خطہ بھی ہے۔ اس خطے کی زیادہ تر زبانوں کا شمار دنیا کی بڑی اور اہم زبانوں میں ہوتا ہے۔ دکنی اور پنجابی بھی اس خطے کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض قدیر نے ''قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط'' کے ذریعہ تقابلی لسانیات کی ایک پائیدار بنیاد رکھ دی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر امجد علی شاکر کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ریاض قدیر نے اس کتاب کے پہلے باب میں تاریخ اور اینتھر وپولوجی کی مدد سے دکنی اور پنجابی کا رشتہ دریافت کیا ہے اگلے باب میں انہوں نے قواعد کی سطح پر ان دونوں کا رشتہ دریافت کیا ہے، تیسرے باب میں لفظ کی لسانیات کو پیش کیا ہے اور دکنی، اردو اور پنجابی کے لغوی رشتے کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب کئی سطح پر متاثر کرتی ہے ایک سطح پر تو 'سب رس' پڑھنے والے طلبا کو متاثر کرتی ہے دوسری سطح پر یہ ایک ایسا کام ہے جو تاریخی لسانیات اور تقابلی لسانیات میں ایک بنیاد بنتا ہے اور اس سے آگے بڑھیں تو یہ وہ کام ہے جو ایک طالب علم سے لے کر محقق تک کے لیے علم کا ذریعہ بنتا ہے یہ ہر سطح کے طالب علم کو کئی سطحوں پر متاثر بھی کرتی ہے اور مستفید بھی کرتی ہے۔[۲۲]

یہ کتاب تین ابواب میں منقسم ہے۔ باب اوّل ''قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط کا تاریخی پس منظر'' میں ڈاکٹر ریاض قدیر نے دکنی اور پنجابی کے لسانی روابط کو تاریخی تناظر میں ثابت کرنے کے لیے اہلِ دکن اور اہلِ پنجاب کے باہمی سماجی روابط کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ الفاظ ہواؤں کے دوش پر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر نہیں کرتے بلکہ انسانوں کے باہمی رابطے سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے انسان کے سماجی رابطے بڑھتے گئے زبانیں بھی پھیلتی پھولتی رہیں اور یہ انسان کی مختلف نوعیت کی ضروریات ہی تھیں جنہوں نے نہ صرف انسان کے باہمی فاصلوں کو سمیٹا بلکہ ان کے لسانی روابط کی ترویج بھی کی۔ یہ ضروریات ہی تھیں جو انسان کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لے گئیں اور یوں انسان جہاں جہاں گئے اپنی زبانیں بھی ساتھ لے گئے اور ان کے صدیوں کے باہمی لسانی اشتراکات سے نئی نئی زبانیں وجود میں آئیں۔ برِ صغیر کے خطے میں دکن اور پنجاب کے فاصلے بھی سینکڑوں میلوں پر محیط تھے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر ان علاقوں کی زبانوں میں لسانی روابط کی صورت گری کیونکر ممکن ہوئی؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں ڈاکٹر ریاض قدیر قبل از مسیح کی اس عہد کی تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں جب اس خطے میں آریاؤں کی آمد سے قبل دراوڑ آباد تھے۔ آریا ایک طاقتور قوم تھے جبکہ ان کے مقابل دراوڑ نسبتاً کم زور قوم تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کوئی طاقت ور

قوم کسی کم زور قوم پر حملہ آور ہو کر اس کے خطے پر قابض ہوتی ہے تو کم زور قوم کی طرف سے مزاحمت اور بچاؤ کے مختلف رویے جنم لیتے ہیں اور ان میں سے ایک رویہ اس علاقے سے بھاگ جانے یا ہجرت کرنے کا ہوتا ہے۔ ایسا ہی رویہ دراوڑ قوم اپنانے پر مجبور ہوئی اور آریاؤں کے مقبوضہ علاقہ سے دور برِ صغیر کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔ ان ہی حصوں میں سے ایک حصہ برِ صغیر کا وہ علاقہ تھا جسے آج ''دکن'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بقول: ''ڈراویڈوں نے دکن میں بڑی قوت حاصل کر لی اور دریائے کاویری کے اطراف میں ان کا تمدن پھیلنے لگا ڈراویڈوں کے متعدد گروہ تھے جن میں کنڑی، تلنگی، تامل اور ملیالم بولنے والے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ تھے۔''[۲۳] آریاؤں کے اس حملے اور دراوڑوں کی اس ہجرت نے نہ صرف مستقبل کے لسانی بلکہ تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی منظر پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ ''یہی وجہ ہے کہ دراوڑی زبانیں بولنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی دکن میں آباد ہے جن میں تلگو، تامل، ملیالم، کنڑی اور دکنی زبان بولنے والے افراد شامل ہیں''[۲۴]۔ ماہرینِ لسانیات نے دنیا کی زبانوں کو آٹھ بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے ایک اہم خاندان ''دراوڑی'' ہے۔ اس سے اس زبان کی اہمیت اور دیگر زبانوں پر اس کے اثرات اور لسانی روابط کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''اب تو ماہرین کا ایک ایسا گروہ بھی ملتا ہے جن کی دانست میں خود اردو نے بھی دراوڑی ہی سے جنم لیا ہے''۔[۲۵] لہٰذا اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دراوڑی نے خاص طور سے اس خطہ کی مختلف زبانوں کی نشو و نما میں کلیدی کردار ادا کیا جن میں سے پنجابی اور دکنی خاص طور سے نمایاں ہیں۔ دراوڑی، پنجابی اور دکنی پر کس طور اثر انداز ہوئی اور اس نے پنجابی اور دکنی کے لسانی اشتراک میں کیا اہم کردار ادا کیا اس کا کھوج لگاتے ہوئے ڈاکٹر ریاض قدیر لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستان کی بعض قدیم مقامی زبانوں (دکنی، پنجابی، براہوی) اور پراکرتوں میں پائے جانے والے غیر آریائی عناصر کا تعلق دراوڑی قبائل کی بولیوں سے ہے۔ ایسی بولیوں میں پنجاب اور دکن کی بولیاں بھی شامل ہیں۔ گویا دونوں علاقوں (دکن اور پنجاب) کے قدیم باشندے نسلاً دراوڑ ہیں اور ایک ہی زبان بولتے تھے۔ دونوں زبانوں (دکنی اور پنجابی) میں موجود مشترک الفاظ کی تحقیق سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ الفاظ زیادہ تر دراوڑی الاصل ہیں اور دیگر دراوڑی الاصل زبانوں (مثلاً براہوی وغیرہ) میں پائے جانے والے ذخیرہ الفاظ سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے۔''[۲۶]

تاریخی حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر ریاض قدیر دکنی اور پنجابی کے کثیر مشترک الفاظ کو اسی عہد کی یادگار قرار دیتے ہیں جبکہ دکن اور پنجاب کے قدیم باشندوں کے مابین جغرافیائی حدود حائل نہ تھیں اور وہ ایک ہی جگہ آباد تھے۔ حوادثِ زمانہ نے انہیں ایک دوسرے سے پرے جا پھینکا لیکن تمام تر اختلافات اور دوریوں کے باوجود لسانی رشتے کمزور نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد نے جہاں اس خطے کو مختلف سماجی، سیاسی، تہذیبی، تغیر و تبدل سے دوچار کیا وہیں زبان پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس پس منظر میں ترکوں،

مغلوں، ایرانیوں، عربوں اور افغانوں کی آبادکاری اور اختلاط کے نتیجے میں زبانیں بھی وسیع پیمانے پر تبدیلیوں کے عمل سے گزریں۔ اثر و نفوذ کے اس عمل نے مقامی اور غیر ملکی زبانوں کو وسعت بخشی اور اسی عمل کے نتیجے میں اردو زبان کا ڈھانچہ بھی تعمیر ہوا۔ تاریخ کے اس لسانی عمل کو ڈاکٹر ریاض قدیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد سے ہند آریائی زبانوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مسلمان اگر چہ پہلے پہل ۷۰۵ میں سندھ پر حملہ آور ہوئے مگر پنجاب ان کا اولین اور مستقل مسکن اس وقت بنا جب (۹۹۷) میں محمود غزنوی نے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنا لیا اور ۱۱۹۳ تک پنجاب میں مسلمانوں کی حکمرانی مستقل بنیادوں پر قائم رہی۔ مسلمان جن کی زبان عربی، فارسی، ترکی تھی دوسو سال تک اہلِ پنجاب (جن کی زبان پنجابی تھی) کے ساتھ سماجی روابط میں منسلک رہے۔ اس عرصہ میں ترک، عرب، مغل، ایرانی اور افغان وغیرہ یہاں آباد ہو گئے اور بقول حافظ محمود شیرانی اس وسیع اور طویل سماجی اختلاط سے ایک نئی زبان (اردو) کا ہیولیٰ خطہ پنجاب میں تیار ہوا اور پھر غوری عسا کر کے ساتھ ۱۱۹۳ء میں مسلمان اسی زبان کو لے کر دلی کی طرف بڑھے۔''[۲۷]

اپنے اس بیان کی تائید میں ڈاکٹر ریاض قدیر نے حافظ محمود شیرانی کا وہ بیان نقل کیا ہے جس کے مطابق قطب الدین ایبک کے ساتھ ہجرت کر کے دہلی جانے والوں میں سب سے زیادہ تعداد پنجابیوں کی تھی۔ پنجابیوں کے ساتھ ساتھ جو دیگر لوگ ہجرت کر کے دہلی گئے وہ اپنے ساتھ ایک ایسی زبان لے کر گئے تھے جس میں وہ ایک دوسرے سے تکلم کر سکتے تھے اور جس کو وہ پنجاب میں رہ کر بولتے رہے تھے۔ اس تاریخی لسانی عمل کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی بھی ''دکن میں اردو'' میں اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں کہ:

''مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اول انہوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور سے زیادہ تر فارسی تھی پنجاب سے لیکر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہاں 'جدید ہندو آریائی دور کی پراکرت' زبان بولی جاتی تھی اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔۔۔ شمال کے فاتح جب ۵۸۸ھ میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کر لی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رخ کیا۔۔۔ یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے یہاں نہیں تھی اس کے برخلاف شمال میں برج مروج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی عام

طور سے پردیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی۔''[۲۸]

نصیرالدین ہاشمی کے مذکورہ بالا بیان سے فوری طور پر یہی خیال آتا ہے کہ گویا مسلمان فاتحین پنجاب میں کچھ عرصہ قیام کے فوراً بعد ہی دہلی روانہ ہوگئے جبکہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان فاتحین قریباً دوسوسال تک پنجاب میں قیام پذیر رہنے کے بعد دہلی روانہ ہوئے۔ دوسوسال کا عرصہ غیر ملکی فاتحین کی زبان اور مقامی زبان کے اثر ونفوذ کے نتیجہ میں ایک نئی زبان کی تشکیل کے لیے بہترین عرصہ تھا اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسوسال کے اس عرصہ میں ایک نئی زبان وجود میں آچکی تھی اور یہ وہی زبان تھی جسے ماہرینِ لسانیات ''اردو'' قرار دیتے ہیں۔ اسے مکمل زبان بھی خیال کیا جاسکتا ہے اور زبان کا ڈھانچہ بھی یا ایک ایسی ناپختہ زبان جو دہلی اور دکن میں طویل قیام کے دوران پختگی کے مزید مراحل سے گزری اور دکن میں نکھر کر سامنے آئی۔ ڈاکٹر ریاض قدیر اس تاریخی لسانی عمل میں علاؤ الدین خلجی اور محمد تغلق کے عہد کو خاص اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ پنجاب سے مسلمان فاتحین کی دلی اور دلی سے دکن ہجرت، دکنی اور پنجابی کے لسانی اشتراک میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر اس لسانی عمل کے ضمن میں دو اہم تاریخی و سیاسی کرداروں علاؤ الدین خلجی اور سلطان محمد تغلق کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ علاؤ الدین خلجی کے دکن پہنچنے اور وہاں کے عوام کو میسر آنے والے سماجی ولسانی اختلاط کی بابت ڈاکٹر ریاض قدیر لکھتے ہیں کہ:

> ''بہرحال دلی سے یہی مسلمان افواج اور فاتحین تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر ۱۲۹۴ء میں علاؤ الدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچتے ہیں جب علاؤ الدین خلجی دیوگری (دکن) کے راجہ کو شکست دے کر اپنا باج گزار بنالیتا ہے اور پھر چند برس بعد ہی اس کا جرنیل ملک کافور مہاراشٹر آندھرا اور کرناٹک کو فتح کرتا ہوا کارومنڈل کے ساحل تک جا پہنچتا ہے۔ اس فاتحانہ یلغار کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکن کے تمام علاقے باقاعدہ طور پر مسلمانوں کی سلطنت میں شامل ہوگئے اور نوآمدہ فاتحین اور ان کے متعلقین یہاں آباد ہوگئے اور شمالی ہند سے آنے والے ایسے لوگوں کی بڑی تعداد دکن میں منتقل ہوگئی جن کی زبان میں پنجابی کے گہرے اثرات موجود تھے اور اس طرح دکنی اور پنجابی زبان کے حامل افراد کو سماجی اختلاط کے مواقع میسر آنے لگے۔''[۲۹]

ڈاکٹر ریاض قدیر اس عہد کو نئی لسانی تشکیل کے لیے خاص طور پر اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں:

> ''محمد تغلق نے دلی کی ساری آبادی کو دولت آباد (دکن) منتقل کر دیا اور شمالی اور دکن کے باشندے ایک بہت بڑے سماجی وتہذیبی اختلاط سے دوچار ہوئے اور لسانی سطح پر زبانوں میں دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دلی سے دکن پہنچنے والے نوآبادکار اپنے ساتھ جو زبان لائے تھے وہ فاتحین اور مفتوحین کے باہمی میل جول سے وجود میں آئی تھی اور اپنی ابتدا کے زمانے سے اپنے اندر پنجابی کے معتد بہ اثرات جذب کر چکی تھی، لہٰذا دکن کی مقامی زبان اور شمالی ہند سے آنے والی

زبان (جس میں پنجابی کا ایک بڑا عنصر موجود تھا) کو ایک بار پھر قریب آنے کے مواقع ملے۔ اس زمانے میں دکن میں اردو زبان (دکنی اردو) کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ دور ہندوستان میں بالعموم اور دکن میں بالخصوص لسانیوں تبدیلیوں کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔''۳۰

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی اپنی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' میں محمد تغلق کے اس فیصلے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے لسانی عمل کو اہم قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''محمد تغلق کے اس فیصلے سے دلی کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ اردو زبان اپنی ابتدائی صورت میں دکن جا پہنچی تھی۔ اردو کے حوالے سے یہ نقلِ لسان کا بہت بڑا عمل تھا۔ شمالی ہند سے پہلی بار آبادی کا اتنا بڑا حصہ جنوبی ہند میں منتقل ہوا تھا۔ دکن کی سرزمین پر شمالی ہند کی زبان بولنے والی آبادی کی آبادکاری سے ایک نیا لسانی عمل شروع ہوا۔ آہستہ آہستہ سماجی عمل بڑھنے سے دکن کی زبانوں سے 'زبان دہلوی' کا میل ملاپ ہوا اور مقامی بولیوں اور زبانوں کے اشتراک سے زبان دہلوی ایک نئی شکل اختیار کرنے لگی اور یہی شکل بعد ازاں 'دکنی' کہلائی۔ جو 'قدیم اردو' کی ابتدائی شکل ہے۔''۳۱

ڈاکٹر ریاض قدیر نے اس عہد کے تہذیبی تصادمات اور سیاسی واقعات کے نتیجے میں رونما ہونے والے لسانی تغیرات کی عکاسی کے لیے دکن کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی کے ساتھ ساتھ ادبی صورتحال بھی صراحت سے بیان کی ہے۔ اس دور کی مذہبی اور ادبی صورتحال نے خاص طور سے پنجابی اور دکنی کے لسانی اشتراک میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس دور کے نثری اور شعری سرمایے کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض قدیر نے ثابت کیا ہے کہ ''یہ زبان اپنے اندر بہت سے ایسے عناصر لیے ہوئے ہے جو پنجابی اور ہریانی سے ماخوذ تھے''۔۳۲ اس کے ثبوت کے طور پر ڈاکٹر ریاض قدیر نے خاص طور سے شاہ میراں شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، میاں خوب محمد چشتی وغیرہ کی تحریروں سے ایسے الفاظ کی مثالیں کشید کر کے پیش کی ہیں جو کہ دکنی ادب کا حصہ ہیں لیکن آج بھی پنجابی زبان میں مستعمل ہیں۔ یہاں اس قسم کے جائزے کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ میاں خوب چشتی کی کتاب ''خوب ترنگ'' میں درج ذیل نمونہ کلام پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر ریاض قدیر نے اس میں مستعمل دکنی الفاظ کے پنجابی الفاظ سے اشتراک کی وضاحت کی ہے جو کہ ان کے عمیق مطالعہ اور تحقیقی جستجو کی آئینہ دار ہے:

''یہ تو کہیں فلانے یار ایسا بوجھ کرے انکار
اون تھیں میں سنیا دن رات اوس منہ یاد رہے کچھ بات
غلط نہ پکڑیں اہواں جان درس کہوں دے توں من آن

کہیا بمعنی کہا، یار بمعنی دوست، سنیا بمعنی سنا، دن بمعنی دن، رات بمعنی رات، اوس بمعنی اس، منہ بمعنی منہ، یاد بمعنی یاد، سنیا بمعنی سنا، آھوان بمعنی آہیں، درس بمعنی دیدار، توں بمعنی تو، آن بمعنی آ کر استعمال کیے گئے ہیں

اور پنجابی زبان کے دامن میں یہ الفاظ اپنی اسی حیثیت سے آج بھی زندہ ہیں۔ ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے ورنہ دکن میں یہ اثر بہت زیادہ ہے۔ ان عناصر کے مطالعے سے اردو زبان کی ارتقائی منزلوں کا ثبوت بخوبی مل جاتا ہے۔''۳۴ ڈاکٹر ریاض قدیر نے باب اوّل کے اس حصہ میں پنجابی اور دکنی کے کلاسیکی متون سے مزید کئی ایسی مثالیں دی ہیں جو کہ دکنی اور پنجابی کے لسانی اشتراک وارتباط کا بیّن ثبوت ہیں۔

''جس طرح ہر شے کا ظاہر اور باطن ہوتا ہے۔ اسی طرح الفاظ کا بھی ظاہر و باطن ہوتا ہے۔ ظاہر وہ ہے جس کا تعلق صَرف سے ہے یعنی اس میں صرف لفظ کی صورت کی تبدیلی وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور لفظ کا باطن اس کا مفہوم اور معنی ہیں۔ اس کی بحث نحو میں ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ تر بحث لفظ کے باطن یعنی اس کے معنی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔''۳۵ ڈاکٹر ریاض قدیر نے دکنی اور پنجابی کے لسانی اشتراک کی تلاش میں دونوں زبانوں کے ظاہر و باطن تک رسائی کی عمدہ کاوش کی ہے۔ انہوں نے محض دکنی اور پنجابی کلاسیکی متون سے الفاظ کی مثالیں دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسرے باب ''دکنی اور پنجابی کے صرفی ونحوی اشتراکات'' میں صرف ونحو کے مختلف اجزا کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''قواعد صرف ونحو کے حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں زبانوں کے لسانی ڈھانچوں میں حیرت انگیز مماثلتیں دکھائی دیتی ہیں۔ جو ان دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی مزید تصدیق کرتی ہیں۔ دونوں زبانوں (دکنی اور پنجابی) میں موجود اسماء اور ان کی حالتیں، بنیادی افعال اور ان کی مختلف کیفیات (خصوصاً فعل ماضی اور فعل مستقبل) میں اشتراکات بہت نمایاں ہیں۔ مصادر، مضارع صفات کی صورتوں میں بھی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ تذکیر وتانیث اور واحد جمع کے کئی قواعد ایک جیسے ہیں۔ نیز اکثر حروف (حروف جار، حرفِ نہی، حرفِ اشارہ اور حرفِ عدد) میں بھی خاصی مماثلتیں موجود ہیں''۔۳۶

ذیلی عنوانات ''اسما اور ان کی حالتیں''، ''فعل کی مصدری صورتوں میں مماثلتیں''، ''مشترک ضمائر اور ضمائر سے متعلق قواعد''، ''اسما اور صفات کی نفی کے لیے مشترک سابقے''، ''حروف اور علامتوں کے اشتراکات''، ''فعل اور اس کی حالتیں'' کے تحت ڈاکٹر ریاض قدیر نے ''صرف ونحو'' کے مباحث کو کلاسیکی متون سے نادر امثلہ کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہ مثالیں دکنی کلاسیکی متون کدم راؤ پدم راؤ (فخر دین نظامی)، کلیات قلی قطب شاہ (قلی قطب شاہ)، قطب مشتری ()، پھولبن (ابن نشاطی)، دیوان ہاشمی ()، سب رس (ملا اسداللہ وجہی)، دیوان نصرتی (نصرتی)، کلیاتِ غواصی (غواصی) گلشنِ عشق (نصرتی)، دیوان حسن شوقی (حسن شوقی)، کلیاتِ شاہی (علی عادل شاہی)، کلیاتِ ولی (ولی دکنی)، پنجابی کلاسیکی متون، کلیات بلھے شاہ، (بلھے شاہ)، قصہ مرزا صاحباں (حافظ برخوردار)، کافیاں شاہ حسین (شاہ حسین)، احوال الآخرت (حافظ محمد)، دامن دے موتی (استاد دامن)، ابیاتِ باہو (سلطان باہو)، سیف الملوک (میاں محمد بخش)، ہیر وارث شاہ (وارث شاہ)، بول فریدی (بابا فرید) اور اردو

کلاسیکی متون، کلیات میر (میر تقی میر)، کلیاتِ سودا (مرزا محمد رفیع سودا)، دیوانِ غالب (اسداللہ خاں غالب) وغیرہ سے دی گئی ہیں جو کہ ڈاکٹر ریاض قدیر کے عمیق مطالعہ کی عکاس ہیں۔ اس حصہ سے دکنی و پنجابی کے صرفی و نحوی اشتراک کی چند مثالیں دیکھیے۔

''اسم فاعل'' کی مثال:

''دونوں زبانوں میں اسم فاعل بنانے کے لیے مصدر کے ساتھ 'ہار' یا 'ہارا' لگاتے ہیں جو سنسکرت کے تتبع میں ہے۔ مثلاً سرجن ہار، کرن ہار۔ دکنی شاعری میں اس طرح کے اسم فاعل کی مثالیں عام ہیں۔ صرف دو اشعار دیکھیے:

رچن ہار انگے رچن ہار توں رہن ہار پچھے رہن ہار توں

(کدم راؤ پدم راؤ، ص ۶۵)

خوبی و بدی سب کے پوچھن ہار علی انصاف ہر ایکس کا کرن ہار علی

(کلیات قلی قطب شاہ، ص ۲۳)

پنجابی کتب میں بھی اس کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً سلطان باہو کا مشہور مصرع ہے:

تاڑی مار اڑا نہ باہو اساں آپے اڈن ہارے ہو

(ابیاتِ باہو، ص ۲۸۷)''[۳۷]

''اسمائے صفات'' کی مثالیں:

''دونوں زبانوں میں بہت سے اسمائے صفات ایک جیسے ہیں جو اردو سے مختلف صورت رکھتے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اُچا (اونچا)	بتر (بدتر، برا)	بڑبولا (باتونی)
اگے (آگے)	چس (لطف)	
ڈونگا (گہرا)	ڈونگی (گہری)	سُکا (سوکھا، خشک)
گھٹ (کم)	سوائی (زیادتی)[۳۸]	

مشترک حروف اور علامتیں میں ''متروک حروف'' کی مثالیں

''دکنی اور پنجابی کے قدیم متون میں بعض ایسے مشترک حروف بھی پائے جاتے ہیں جو آج ان دونوں زبانوں میں رائج نہیں رہے۔ مگر قدیم ادبی متون میں عام ملتے ہیں اور دونوں زبانوں میں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً لگ (بمعنی تک)

دکنی مثال: کپٹ بھاؤ تھیں مجھ اٹھے سیس اگ

بلندی چلے پائے تھیں سیس لگ

(کدم راؤ پدم راؤ، ص ۱۰۵)

پنجابی مثال: رن رووے دو چار دن ،بھین رووے چھے مانہہ
جد لگ سانس کرنگ وچ تد لگ روسا ماں
(مرزا صاحباں، ص ۱۰۱) ۳۹

''مشترک حروف اعداد'' کی مثالیں:

''(ا) دکنی اور پنجابی میں بعض حروف اعداد بھی ایک ہی طرح لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

ہک۔اک (بمعنی ایک)	اَدھی (بمعنی آدھی)
لکھ (بمعنی لاکھ)	پنج (بمعنی پانچ)
دوجا (بمعنی دوسرا)	ست (بمعنی سات)'' ۴۰

ڈاکٹر ریاض قدیر نے اس حصہ میں دکنی اور پنجابی کی صرفی ونحوی مماثلتوں کو اس طرح کی بے شمار مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ بلاشبہ یہ مثالیں دونوں زبانوں کے قدیم لسانی روابط کی عکاس ہیں اور دلچسپی کی حامل بھی ہیں۔

باب سوم ''لغوی اشتراکات'' کی نادر امثلہ پر مشتمل ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بقیہ حصوں کی بہ نسبت زیادہ ضخیم ہے اور امثلہ کا وسیع ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ اس حصہ کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ریاض قدیر لکھتے ہیں کہ:

> ''اگلے صفحات میں دونوں زبانوں میں پائے جانے والے سینکڑوں ہم معنی الفاظ کی فہرست دی جا رہی ہے جس سے دونوں زبانوں کے گہرے لسانی روابط کی مزید تائید ہوتی ہے۔ ہم معنی الفاظ کی اس فہرست میں ہر لفظ کے ذیل میں دونوں زبانوں (دکنی اور پنجابی) کے کلاسیکی متون سے اس لفظ کے استعمال کی عملی مثالیں بھی فراہم کر دی گئی ہیں جن کے مطالعے سے جہاں دونوں زبانوں کے مشترک ذخیرہ الفاظ کا علم ہوتا ہے۔ وہاں ان کے استعمال کے ادبی قرینوں کا ادراک بھی کیا جا سکتا ہے۔'' ۴۱

ڈاکٹر ریاض قدیر نے اس حصہ میں حروفِ تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے الفاظ کی مثالیں دی ہیں اور صرف الفاظ کا اندراج ہی نہیں کیا بلکہ دکنی اور پنجابی کلاسیکی متون میں ان کے استعمال کی مثالیں بھی درج کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر امثلہ کے ماخذات وہی کلاسیکی متون ہیں جن سے صرفی ونحوی نمونے دیے گئے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

دکنی/پنجابی آپے **اردو** خود ہی

دکنی مثال آدمی نے عقل چھوڑ دیا، دیوانہ ہوا، اپنا سر آپے پھوڑ دیا۔
(سب رس، ص ۱۶)

پنجابی مثال ماہی ماہی کو کدی
میں آپے رانجھن ہوئی
(کافیاں شاہ حسین، ص ۶) ۴۲

دکنی/پنجابی باتاں **اردو** باتیں

دکنی مثال بھلیاں باتاں یہ خوباں کی
بھولے کیوں نصرتی کا دل

(دیوانِ نصرتی، ص ۶۰)

پنجابی مثال میں پچھیاں شوہ دیاں واٹاں نی
کوئی کرے اساں نال باتاں نی

(کلیات بلھے شاہ، ص ۳۲۵) ۴۳

دکنی/پنجابی پیاریاں **اردو** پیاری کی جمع

دکنی مثال چیلیاں ناز بھریاں آج، پیاریاں ہیں تمام

(کلیاتِ غواصی، ص ۱۱۸)

پنجابی مثال اپنیاں دھیاں بہتیاں ای پیاریاں ہندیاں نیں

(پنجابی مثال) ۴۴

دکنی/پنجابی ٹُٹنا **اردو** ٹوٹنا

دکنی مثال رقیب بند کیا تھا، سو بند تے ٹٹیا

(سب رس، ص ۶۸)

پنجابی مثال بھَلا ہویا میرا چرخہ ٹٹا
میری جند عذابوں چھٹی

(کلیات بلھے شاہ، ص ۹۲) ۴۵

دکنی/پنجابی چالے **اردو** طریقے، روّیے

دکنی مثال عشق کے چالے کون سنبھالے

(سب رس، ص ۸۰)

پنجابی مثال بھَیڑے چالے جنہاں چلّے اوہو پھَسن اوّلے

(پنجابی اکھان) ۴۶

دکنی/پنجابی سُد (دکنی) **اردو** ہوش
سدھ (پنجابی)

دکنی مثال اس روز سد ہوا سو رین کربلا منے

(کلیاتِ شاہی، ص ۹۳)

پنجابی مثال نیلی آہیں ماریاں نبھڑے کردی وین

ملک الموت ونگاریا، سُدھ نہ دتی لین

(قصہ مرزا صاحباں، ص ۱۰۰) ۴۷

دکنی/پنجابی یہودیاں **اردو** یہودی کی جمع

دکنی مثال کیا سب یہودیاں کوں گھر سے جُدا

(کلیاتِ شاہی، ۶۱)

پنجابی مثال اسرائیل یہودیاں دا ملک اے

(عام پنجابی) ۴۸

ڈاکٹر ریاض قدیر کی اس محققانہ کاوش کے ضمن میں ڈاکٹر فخر الحق نوری کہتے ہیں کہ آج کل صرف ونحو کے حوالے سے علم رکھنے والے یا واجبی سی واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اور لسانیات کے جو بہت سے پہلو ہیں ان سے محققین کا بہت دور کا واسطہ رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب نے بہت عمدگی کے ساتھ قواعد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی چھ سو الفاظ کے حوالے دیے ہیں اور قواعد کے مختلف پہلو مثلاً افعال، مصادر، حروف، ، جمع، تذکیر و تانیث، صفت، موصوف، ضمیر وغیرہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دونوں زبانوں کے اشتراکات کی نشاندہی کی ہے۔ یہ بہت لائقِ تحسین بات ہے کہ جب آج کے دور میں لوگ دکنی زبان سے بہت دور ہو گئے ہیں ایک مکانی فاصلے کے ساتھ ساتھ زمانی فاصلہ بھی پیدا ہو گیا ہے اس میں رہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بڑی کاوش سے تحقیق کی ہے۔ آخری باب میں ڈاکٹر صاحب نے لغوی سطح پر اشتراکات کی نشاندہی کی ہے اور اس میں بھی ان کا سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے قدیم دکنی اور پنجابی الفاظ کو اولاً جگہ دی ہے اور ان کے مقابل اردو میں جو الفاظ مستعمل ہیں وہ درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اگر کہیں معنوی اشتراک کے ساتھ ساتھ معنوی اختلاف ہے تو اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح املا کے حوالے سے جو تبدیلیاں آ چکی ہیں اور تلفظ کے حوالے سے جو فرق آ گیا ہے ان کی نشاندہی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا وژن کثیر الجہتی رہا ہے اور تقابلی لسانیات کے حوالے سے جو پہلو بھی سامنے لائے جا سکتے تھے وہ بہت سلیقے سے، محنت اور تحقیق سے جمع کیے ہیں۔ اہلِ علم کے لیے یہ کتاب کسی قیمتی ارمغان سے کم نہیں ہے۔ ۴۹

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ''قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط'' نہ صرف اردو تقابلی لسانیات میں ایک اہم ترین اضافہ ہے بلکہ مستقبل کے لسانی و لسانیاتی محققین کے لیے ایک عمدہ نمونہ بھی ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر نے تقابلی لسانیات کے پس منظر میں تاریخی و توضیحی لسانیات سے بھی کام لیا ہے اور پنجاب اور دکن کے میلوں کی مسافت پر پھیلے ہوئے مکانی اور صدیوں پر محیط زمانی فاصلوں کو سمیٹنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ اس کتاب میں پیش کردہ صرفی و نحوی اور لغوی اشتراکات کی سینکڑوں مثالیں اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ صدیوں کے تاریخی عوامل کی کارفرمائی نے اگرچہ اہلِ پنجاب اور اہلِ دکن میں زمانی و مکانی بعد پیدا کر دیا لیکن ان کی زبانوں کے

نسلی ارتباط پر کوئی آنچ نہ آسکی۔ پنجابی و دکنی زبانوں کے باہمی اشتراک کا تعین کر کے ڈاکٹر ریاض قدیر نے ثابت کر دیا ہے کہ دونوں زبانوں کی مماثلتیں اتفاقی ہرگز نہیں بلکہ صدیوں کے انسانی و لسانی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ یہ کتاب اس مفروضے کی تصدیق اور توسیع کرتی ہے کہ جسے حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' میں پیش کیا اور جس کی طرف علامہ اقبال نے بھی خفیف اشارہ کیا تھا۔ بلاشبہ ''یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لکھنے والے بہت کم ملتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان موضوعات پر لکھنا زبان کی بقا، زبان کے تسلسل اور زبان کی تہذیبی اہمیت کو اجاگر کرنے میں بہت اہم ہے''۔۵۰ یقیناً اس کتاب کے ذریعہ خاص طور سے دکنی اور پنجابی زبانوں کے ارتقائی مراحل، ان کے تسلسل، تہذیبی اہمیت اور بطِ واشتراک کے عمل میں کارفرما عوامل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''تقریب پذیرائی قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط''، لاہور، ۱۵ فروری، ۲۰۱۸ء

۲۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، ''تقریب پذیرائی قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط''، لاہور، ۱۵ فروری، ۲۰۱۸ء

۳۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۱۷ء، ص: ۱

۴۔ www.ethnologue.com۔ س ن۔ ۲۷ جنوری ۲۰۱۸ء
https://www.ethnologue.com/language/dcc

۵۔ صادق، ڈاکٹر قیوم، دکنی ادب، (حیدرآباد: اعجاز پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء)، ص: ۶

۶۔ ہاشمی، حمیداللہ، مختصر تاریخ زبان و ادب پنجابی، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء)، ص: ۳۹

۷۔ ایضاً، ص: ۴۳

۸۔ ہاشمی، حمیداللہ شاہ، پنجابی زبان و ادب، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء)، ص: ۷

۹۔ شیرانی، محمود، پنجاب میں اردو، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء)، ص: ۸۰

۱۰۔ باقر، ڈاکٹر محمد، اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء)، ص: ۴

۱۱۔ کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء)، ص: ۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص: ۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص: ۵۴

۱۴۔ ہاشمی، نصیرالدین، دکن میں اردو، (حیدرآباد دکن: مکتبہ رحیمیہ، ۱۹۳۶ء)، ص: ۲۶
۱۵۔ شیرانی، محمود، پنجاب میں اردو، ص: ۴
۱۶۔ ایضاً، ص: ۷۷
۱۷۔ خاں، مسعود حسین، مقدمہ تاریخ زبان اردو، (علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۵۸ء)، ص: ۲۰۵۔۲۰۷
۱۸۔ خاں، مسعود حسین، اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر، (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء)، ص: ۸۱
۱۹۔ ایضاً، ص: ۸
۲۰۔ پاک ٹی ہاؤس میں منعقدہ ''تقریب پذیرائی قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط'' میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے طویل اور پُرمغز خطاب میں موضوع سے متعلق گفتگو فرمائی یہاں اس گفتگو کا ماحصل پیش کیا گیا ہے۔
۲۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''تقریب پذیرائی قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط''، لاہور، ۱۵ فروری، ۲۰۱۸ء
۲۲۔ شاکر، ڈاکٹر امجد علی، ''تقریب پذیرائی قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط''، لاہور، ۱۵ فروری، ۲۰۱۸
۲۳۔ زور، محی الدین قادری، ہندوستانی لسانیات، (کراچی: گرین بکس، ۲۰۱۶ء)، ص: ۸۶
۲۴۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، ص: ۱
۲۵۔ اختر، ڈاکٹر سلیم، اردو زبان کیا ہے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص: ۱۲۳
۲۶۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، ص: ۲
۲۷۔ ایضاً، ص: ۳
۲۸۔ ہاشمی، نصیرالدین، دکن میں اردو، ص: ۲۰۔۲۱
۲۹۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، ص: ۴۔۵
۳۰۔ ایضاً، ص: ۵
۳۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص: ۲۷
۳۲۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، ص: ۱۱۔۱۲
۳۳۔ نمونہ کلام کے پہلے مصرعہ میں لفظ ''کہیں'' ہے۔ جبکہ مثال میں ''کہیا'' ہے۔ غالباً نمونہ کلام میں یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

اسی طرح اقتباس میں ''سنیا بمعنی'' سنا بھی دو دفعہ آیا ہے یہ بھی کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

۳۴۔ قدیر،ڈاکٹر ریاض،قدیم اردو(دکنی)اور پنجابی کے لسانی روابط،ص:۱۳

۳۵۔ عبدالحق،مولوی،اردو صرف و نحو،(نئی دہلی:انجمن ترقی اردو(ہند)،۲۰۰۱ء)،ص:۸

۳۶۔ قدیر،ڈاکٹر ریاض،قدیم اردو(دکنی)اور پنجابی کے لسانی روابط،ص:۱۹

۳۷۔ ایضاً،ص:۲۰۔۲۱

۳۸۔ ایضاً،ص:۲۷

۳۹۔ ایضاً،ص:۳۵۔۳۶

۴۰۔ ایضاً،ص:۳۷۔۳۸

۴۱۔ ایضاً،ص:۵۶

۴۲۔ ایضاً،ص:۵۷

۴۳۔ ایضاً،ص:۷۶

۴۴۔ ایضاً،ص:۱۰۰

۴۵۔ ایضاً،ص:۱۱۳

۴۶۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۴۷۔ ایضاً،ص:۱۶۵

۴۸۔ ایضاً،ص:۲۵۵

۴۹۔ نوری،ڈاکٹر فخرالحق،''تقریب پذیرائی قدیم اردو(دکنی)اور پنجابی کے لسانی روابط''،لاہور،۱۵فروری،۲۰۱۸

۵۰۔ تنولی،ڈاکٹر طاہر حمید،''تقریب پذیرائی قدیم اردو(دکنی)اور پنجابی کے لسانی روابط''،لاہور،۱۵فروری،۲۰۱۸

مآخذ:

۱۔ اختر،ڈاکٹر سلیم،اردو زبان کیا ہے،لاہور:سنگِ میل،۲۰۰۳ء۔

۲۔ باقر،ڈاکٹر محمد،اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں،لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۷۲ء۔

۳۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر،اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء۔

۴۔ ''تقریب پذیرائی قدیم اردو(دکنی)اور پنجابی کے لسانی روابط''،لاہور،۱۵

فروری، ۲۰۱۸ء۔
۵۔ خاں، مسعود حسین، اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر، علی گڑھ: شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء۔
۶۔ خاں، مسعود حسین، مقدمہ تاریخ زبان اردو، علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۵۸ء۔
۷۔ زور، محی الدین قادری، ہندوستانی لسانیات، کراچی: گرین بکس، ۲۰۱۶ء۔
۸۔ شیرانی، محمود، پنجاب میں اردو، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۲ء۔
۹۔ صادق، ڈاکٹر قیوم، دکنی ادب، حیدرآباد: اعجاز پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸ء۔
۱۰۔ عبدالحق، مولوی، اردو صرف و نحو، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۰۰۱ء۔
۱۱۔ قدیر، ڈاکٹر ریاض، قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی کے لسانی روابط، لاہور: اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۱۷ء۔
۱۲۔ کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء۔
۱۳۔ ہاشمی، حمید اللہ، مختصر تاریخ زبان و ادب پنجابی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء۔
۱۴۔ ہاشمی، حمید اللہ شاہ، پنجابی زبان و ادب، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔
۱۵۔ ہاشمی، نصیر الدین، دکن میں اردو، حیدرآباد دکن: مکتبہ رحیمیہ، ۱۹۳۶ء۔
۱۶۔ www.ethnologue.com۔ س ن۔ ۲۷ جنوری ۲۰۱۸ء
https://www.ethnologue.com/language/dcc

☆☆☆